اَلْحَمْدُلِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ (العنکبوت:69)

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ۔ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ ۔وَالْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

ہر گل رنگ و بو دیگر است:

نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

اَلنَّاسُ مَعَادِنٌ كَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ ''انسان کانوں کی مانند ہیں، جیسے سونے اور چاندی کی کانیں۔''

کسی انسان میں اللہ نے کوئی صفت رکھی ہے اور کسی میں کوئی۔ اگر انسانوں کی زندگیوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں مختلف صفات نظر آئیں گیں۔

ہر گلِ رنگ و بو دیگر است

''ہر پھول کا رنگ اور ہر پھول کی خوش بو جدا ہوتی ہے۔''

کسی میں کوئی خیر کی بات ہوگی اور کسی میں کوئی شر کی بات ہوگی۔ حتی کہ جس کو ہم بہت ہی برا اور فاسق وفاجر کہتے ہیں ان کی زندگیوں کو قریب سے دیکھیں تو ان میں بھی آپ کو کوئی نہ کوئی اچھی باتیں نظر آجائیں گی۔ گویا انسانوں کی زندگیوں کی عقلی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں۔

خیر اور شر کا ماحول:

مخلوقات میں سے

جو سراپا خیر ہیں، وہ فرشتے ہیں۔

جوسراپا شر ہے، وہ شیطان ہے، اور

جو خیر اور شر کا مجموعہ ہے، وہ حضرت انسان ہے۔

یعنی ہر انسان کے اندر خیر بھی ہے اور شر بھی۔ فرق یہ ہے کہ انسان اگر خیر کے ماحول میں رہے تو اس پر خیر غالب آجاتی ہے اور شر کے ماحول میں رہے تو اس پر شر غالب آجاتا ہے۔ دنیا کے نیک ترین کو اگر برا ماحول مل جائے تو اس کے پھسلنے کے مواقع موجود ہوتے ہیں۔ اور اگر دنیا کے بدترین انسان کو اچھا ماحول مل جائے تو اس کے سنورنے کے مواقع موجود ہوتے ہیں۔ تو ماحول کا انسان پر اثر ہوتا ہے۔

ماحول کے اثرات:

علما نے لکھا ہے کہ جو لوگ مختلف جانور پالتے ہیں ان پر ان جانوروں کا بھی اثر ہوتا ہے۔ مثلاً

جو لوگ گھوڑے پالتے ہیں ان کے اندر شجاعت ہوتی ہے۔

جو اونٹ پالتے ہیں ان کے اندر ہٹ دھرمی ہوتی ہے۔

جو بکریاں پالتے ہیں ان کے اندر عاجزی ہوتی ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر جانوروں کے ساتھ رہنے پر انسان کے اوپر اثرات مرتب ہو جاتے ہیں تو پھر نیک صحبت میں رہنے سے نیک اثرات کیوں مرتب نہیں ہوں گے۔ اسی لیے کہتے ہیں:

اَلصُّحبَۃُ مُؤَثِّرَۃٌ صحبت کے اثرات ہوتے ہیں۔

اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو نیک ماحول میں رکھے۔ نیک دوست بنائے تاکہ وہ اس کو نیکی کے راستے سے ہٹنے نہ دیں، بھٹکنے نہ دیں۔ اگر وہ بھٹکنا بھی چاہے تو وہ اس کو نیکی کی طرف کھینچیں۔ آج کل نوجوان کہتے ہیں: میرے دوست برے ہیں، میں نہیں ہوں۔ وہ برے کام کرتے ہیں، میں تو

صرف دیکھتا ہوں، میں کرتا کچھ نہیں۔ جب بھی کوئی نوجوان یہ بات کرے تو آپ سو فیصد یہ سمجھ لیں کہ یہ بڑے یقین سے جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ خود برے کام نہ کرے۔ دوست ہی سے تو پہچان ہوتی ہے۔ اگر اچھے دوست ہوں گے تو بندہ خود بھی اچھا ہوگا اور اگر برے دوست ہوں گے تو وہ خود بھی برا ہوگا۔ تو انسان جس ماحول میں پرورش پائے اس پر اس ماحول کے اثرات ضرور مرتب ہوتے ہیں۔ نیکی کے ماحول میں رہنے والا اللہ رب العزت کا مقبول بندہ بن جاتا ہے اور برائی کی زندگی گزارنے والا اور برے ماحول میں رہنے والا اللہ رب العزت کا ناپسندیدہ بندہ بن جاتا ہے۔

جسمانی اور روحانی بیماریاں:

انسان کے جسم میں جسمانی بیماریاں بھی ہوتی ہیں اور روحانی بیماریاں بھی ہوتی ہیں۔ جسمانی بیماریاں تو وہ ہیں جو آپ جانتے ہیں۔ جیسے ایک بندے کو بلڈ پریشر ہے، شوگر ہے، السر ہے۔ یہ تو ڈاکٹروں کی ٹرمینالوجی کی بیماریاں ہیں۔ اسی طرح اطبأ کی زبان میں انشقاق الشفتین، رمد چشم، شقیقہ، خناق، قبض، قولنج، وجع المفاصل، عرق النساء، مختلف بیماریوں کے نام ہیں۔

اسی طرح روحانی بیماریوں کے بھی نام ہیں۔ جیسے بغض، حسد، کینہ، تکبر، ریا، کذب، شہوت، کسلان فی الصلوٰۃ، ترک الصوم والزکوٰۃ اور نفاق۔ یہ سب کی سب باطن کی بیماریاں ہیں۔

جسمانی اور روحانی معالج:

جیسے ظاہر کی بیماری کی صورت میں ہم اطبأ اور ڈاکٹروں کی طرف جاتے ہیں، اسی طرح باطن کی بیماریوں کے لیے بھی باطنی اطبأ کی طرف جانا چاہیے۔ اللہ نے باطنی بیماریوں کے لیے بھی اطبأ بنائے ہیں۔ ان کو مشائخ، علما اور صلحا کہا جاتا ہے۔ اور جو ظاہری بیماریوں کو ڈیل کرنے والے ہیں ان کو حکما، اطبا، سرجن، ڈاکٹر اور کمپوڈر کہتے ہیں۔

جسمانی اور روحانی بیماریوں پر کتب:

ظاہری بیماریوں کے لیے اطبأ نے کتابیں لکھی ہیں اور ان کی تفصیلات درج کیں۔مثال کے طور پر: میزان الطب،طب اکبر،شرح اسباب،قانونچہ،منہاج الاطبہ وغیرہ۔اسی طرح باطنی بیماریوں کے علاج کے لیے بھی کتابیں موجود ہیں۔سب سے بڑی کتاب اللہ کا قرآن ،عظیم الشان ہے۔پھر اس کی اگلی تفصیلات بخاری شریف،مسلم شریف،ترمذی شریف،ابوداؤد شریف،نسائی،مؤطین،اخلاق الصالحین وغیرہ۔یہ سب کتابیں انسانوں کی باطنی بیماریوں کو ختم کرنے کے طریقے بتاتی ہیں۔

معالج کی ضرورت واہمیت:

جسمانی بیماریوں کے لیے کوئی بھی آدمی صرف کتابوں تک ہی محدود نہیں رہتا۔وہ نہیں سوچتا کہ جی! مجھے بلڈ پریشر ہے اور میں کتاب سے پڑھ کر بلڈ پریشر کی گولی لے لوں گا۔آپ دیکھیں گے کہ کوئی بھی بندہ کتاب پڑھ کر اپنا علاج نہیں کرتا۔وہ تو ایک سپیشلسٹ سے دوسرے اسپیشلسٹ کے پاس بھاگتا ہے۔بلکہ اگر ایک اسپیشلسٹ بتادے کہ یہ بیماری ہے تو پھر وہ کہتا ہے کہ میں ایک اور اسپیشلسٹ سے ویر فائی کرواتا ہوں۔اسی طرح روحانی بیماریوں کے علاج کے لیے بھی فقط کتابیں کام نہیں آئیں گی۔ان کے لیے بھی کسی نہ کسی طبیب کی ضرورت پڑتی ہے۔شیطان ایک بڑا خوبصورت دھوکہ دیتا ہے کہ تمہیں کیا ضرورت ہے کسی سے اپنی بات کرنے کی؟اپنی اصلاح خود کرلو۔جو اپنا علاج خود کرے گا،بس وہ جلدی مرے گا۔بلکہ ہم نے تو دیکھا ہے کہ جب ڈاکٹر بیمار ہوتا ہے تو وہ فوراً دوسرے ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے۔ڈاکٹر اپنا علاج خود نہیں کرتے۔حالانکہ ان کے اپنے پاس بھی نالج ہوتا ہے۔مگر پھر بھی دوسرے ڈاکٹر کو چیک کرواتے ہیں۔اس سے رائے لیتے ہیں یہ مجھے کیا بیماری ہے؟اپنے بارے میں انسان کی اسیسمنٹ (تشخیص) ٹھیک نہیں ہوتی۔نفس اپنی باتوں کو مزین کر کے پیش کرتا ہے۔انسان کو اپنی برائی

برائی ہی نہیں لگتی اور اپنی چھوٹی سی نیکی بہت بڑی لگتی ہے۔اس لیے انسان اپنے بارے میں نہ تو اپنی ٹھیک رائے قائم کرسکتا ہے اور نہ ہی اپنا علاج خود کرسکتا ہے۔

اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ ایک صاحب کا بیٹا بیمار ہو گیا۔اس کا پیٹ خراب ہو گیا۔لوز موشن لگ گئے۔بیوی نے بہت کہا کہ اس کا علاج کرواؤ،ڈاکٹر کو دکھاؤ اور اس کو دوائی لا کر دو۔اس بیچارے کے پاس پیسے کم تھے۔اس نے سوچا میں نے جو ڈاکٹر کو سو روپیہ فیس دینی ہے تو کیوں نہ میں اس پیسے سے دوائی خرید لوں۔کیونکہ یہ ایک سادہ سی بیماری ہے۔چنانچہ وہ کسی میڈیکل سٹور پر گیا اور اپنے ذہن میں سوچتا رہا کہ بیماری کیا ہے۔وہ یہی سوچتا رہا کہ ایک ہوتی ہے قبض اور ایک ہوتی ہے لوز موشن۔یہ ایک دوسرے کے متضاد بیماریاں ہیں۔اب بچے کو لوز موشن لگے ہوئے ہیں،لہٰذا اگر اس کو لوز موشن لگے ہوئے ہیں اور اگر اس کو قبض کی دوائی دے دیں تو ٹھیک ہونے کی بجائے اور زیادہ پریشان کن حالت ہو جائے گی۔اس نے میڈیکل سٹور پر جا کر کہا:جی!مجھے قبض کی دوا چاہیے۔اس نے دے دی۔جب دوائی دی تو بچے کی حالت اور خراب ہوگئی۔وہ تو مرتے مرتے بچا۔بیوی سمجھدار تھی۔وہ اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔خاوند بھی ساتھ گیا،بچہ تو خیر بچ گیا۔تاہم ڈاکٹر نے پوچھا:تم نے اسے کون سی دوائی دی؟وہ کہنے لگا:میں سے سوچا اس کو لوز لوشن لگے ہوئے ہیں،لہٰذا اگر قبض کی دوا کھالے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔چنانچہ میں نے اسے قبض کی دوا دے دی۔ڈاکٹر نے کہا:عقل کے اندھے!ہماری زبان میں قبض کی دوا کا مطلب ہے،قبض ہے،اسے کھولنے کی دوا دو۔اس دوائی نے تو الٹا پیٹ لوز کر دیا ہے۔جبکہ تمہارے بیٹے کو پہلے ہی موشن لگے ہوئے تھے۔انسان اگر اپنی بیماری کا علاج کرے تو ایسا ہی علاج کرتا ہے

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

نفس تو یہی کہے گا: بھئی! خواہش پوری کرلو، سب ٹھیک ہے، مسئلہ ہی کوئی نہیں۔اس لیے معالج کی ضرورت پیش آتی ہے۔

جسمانی اور روحانی علاج کے طریقہ ہائے کار:

جسمانی علاج کے لیے کئی طریقہ کار ہیں۔ایک کو ہم کہتے ہیں: یونانی طب۔ ایک کو کہتے ہیں: ایلو پیتھک۔ایک کو کہتے ہیں: ہومیو پیتھک۔آج کل ایک نیا طریقہ علاج بھی آ گیا ہے اس کو کہتے ہیں: آکوپنکچر۔ یہ عجیب طریقہ ہے۔ایک انچ، دو انچ، تین انچ کی لمبی لمبی سوئیاں بندے کے اندر چبھو دیتے ہیں اور بیماری کا علاج ہو جاتا ہے۔ایک بندے کو نیند نہیں آتی ۔اس کو ڈاکٹر صاحب ایک سوئی چبھوئیں گے اور وہ ایسے سوئے گا جیسے نشے کی دوا پی کے سو رہا ہے۔

جس کا جی چاہے وہ ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، طب اور آکوپنکچرنگ میں سے جو مرضی طریقہ علاج اختیار کرے۔ایسے ہی اللہ رب العزت نے روحانی بیماریوں کے علاج کے بھی مختلف طریقے بنا رکھے ہیں۔ایک روحانی طریقہ کار ہے نقشبندیہ، ایک ہے چشتیہ، ایک ہے قادریہ اور ایک ہے سہروردیہ۔کہیں ذکر خفی سے علاج کرتے ہیں اور کہیں ذکر جہر سے علاج کرتے ہیں۔انداز مختلف ہیں مگر طریقے سارے ٹھیک ہیں۔ان طریقوں سے انسان کو واقعی روحانی طور پر صحت ملتی ہے۔

جسمانی اور روحانی غذائیں:

اس کے بعد اگر انسان اچھی غذا استعمال کرے تو اس کی صحت اچھی ہو جاتی ہے۔ بیمار آدمی کو گندم کی روٹی دیتے ہیں، پھر جو کی روٹی دیتے ہیں، دودھ پلاتے ہیں، جوس پلاتے ہیں۔جسمانی غذائی استعمال کروائی جاتی ہیں۔ایسے ہی انسان کی روحانی خوراک انوارات، فیوضات، تجلیات اور سکینہ ہیں جو انسان کی روح کو ٹھیک کر دیتی ہیں۔

دستور یہ ہے کہ انسان کا جسم مٹی سے بنا اور اس کی خوراک بھی مٹی سے نکلی۔ اور انسان کی روح اوپر سے آئی اور اللہ نے اس غذا کا انتظام بھی اوپر سے کیا۔ اس لیے ایسی محفلوں میں بیٹھنا جن میں انوارات اور تجلیات برستی ہوں اور رحمتیں برستی ہوں، وہاں روحانی بیماریوں کا علاج خود بخود ہو جاتا ہے۔

صحیح علاج نہ کروانے کا نقصان:

اگر جسمانی بیماریوں کا صحیح طرح علاج نہ کروائیں تو بندے کی جان گئی اور اگر روحانی بیماریوں کا صحیح علاج نہ کروائیں تو بندے کا ایمان گیا۔ کتنے ایسے لوگ ہیں کہ ان کا فسق اتنا بڑھتا ہے کہ وہ ایسی باتیں کر دیتے ہیں کہ ایمان سے خالی ہو جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ ہم انجینئرز کی میٹنگ میں بیٹھے تھے۔ ایک انجینئر نے اپنے ورکر کو بلایا۔ فورمین صاحب کو۔ پھر اس فورمین نے ایسی بات کی کہ توبہ توبہ۔ اس نے ایسی خطرناک بات کی کہ میں تو کانپ ہی گیا۔ وہ فورمین خدا کے بارے میں کفریہ بات کرنے لگا۔ معاذ اللہ..... نقلِ کفر کفر نہ باشد..... وہ کہنے لگا:

''اگے تے پنجی منٹی سنداسی، پتہ نئیں کتھے چلا گیا سنداای نئیں، اسیں وی نمازاں پڑھنیاں چھڈ دتیاں نیں۔''

سوچیں کے ایسے بندے کا ایمان کہاں سلامت رہا۔ اس لیے جسمانی علاج سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ انسان اپنا روحانی علاج کروائے۔

جسمانی اور روحانی بیماریوں کی علامات:

یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ جسمانی بیماریوں کی علامات ہوتی ہیں۔ مثلاً:

☆ جس بندے کو ہائی بلڈ پریشر کی بیماری ہے وہ محسوس کرے گا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے، چہرہ پھول رہا ہے، کانوں میں کچھ محسوس ہوگا۔ اس کو ڈاکٹر کہے گا: جی! آپ کا بلڈ پریشر ہائی ہو چکا ہے۔

☆ایک بندے کو بار بار بیت الخلاء میں جانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ بھی ایک بیماری کی علامت ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر کہے گا: جی! آپ کو شوگر ہے۔

☆ایک بندہ چند منٹ چلتا ہے اور سانس پھول جاتا ہے۔ ڈاکٹر اسے کہے گا: جی! آپ کو دل کی بیماری ہے۔

ان علامات کی بنیاد پر جب انسان جسمانی طور پر بیمار ہوتا ہے اس کے لیے کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح روحانی بیماریوں کی علامت یہ ہے کہ جو انسان روحانی طور پر بیمار ہوتا ہے اس کے لیے اعمال کرنے مشکل ہو جاتے ہیں۔ نماز کے لیے اس کا دل نہیں کرتا۔ تلاوت نہیں ہو سکتی۔ تہجد کے لیے آنکھ ہی نہیں کھلتی۔ سچ بولنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اپنی غلطی کو تسلیم کرنا مصیبت نظر آتا ہے۔

میں اسے سمجھوں ہوں دشمن جو مجھے سمجھائے ہے

سمجھا کے دیکھو، وہ آگے سے گلے پڑ جائے گا۔ بہن کو کہتا ہے: نماز پڑھ۔ وہ کہے گی: جا! پہلے اپنی بیوی کو سمجھا۔ یہ تسلیم نہیں کرے گی کہ ہاں میں نماز نہیں پڑھتی۔ اپنے ہی بات نہیں مانتے۔ اس لیے انسان اپنی جسمانی بیماریوں سے زیادہ اپنی روحانی بیماریوں کے علاج پر توجہ دے۔

''سلسلہ'' کس کو کہتے ہیں؟

یہ جو ''سلسلہ'' کہا جاتا ہے، یہ ان روحانی طبیبوں کی ایک چین (زنجیر) ہے جو روحانی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ ہمارے طبیبِ اعظم، مرشدِ اعظم اور معلمِ اعظم حضرت محمد مصطفٰے احمد مجتبےٰ ﷺ ہیں۔ ان سے روحانی بیماریوں کا علاج صحابہ نے سیکھا۔ پہلے خود مریض تھے لیکن جب اللہ کے محبوب ﷺ کی خدمت میں آئے تو علاج ہو گیا۔ اور علاج بھی کیسا ہوا؟

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے وہ کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

روحانی طور پر مردہ لوگ آتے تھے اور ایمان کی دولت سے مالا مال ہو کر واپس جاتے تھے۔ پھر صحابہ j سے تابعین نے اپنا روحانی علاج کروایا۔ پھر ان سے تبع تابعین نے کروایا اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ یہ سلسلہ ہمارے پاس آج تک محفوظ ہے۔ لوگ اپنے نسب کو محفوظ رکھتے ہیں اور کہتے ہیں: جی! ہم حسنی حسینی سید ہیں اور پھر اس سلسلے کو نبی علیہ السلام سے شروع کر کے نیچے تک لے کے آتے ہیں۔ جو علوی حضرات ہیں وہ کہتے ہیں: جی! ہم محمد بن حنیفہؒ کی اولاد میں سے ہیں۔

اسی طرح ہمارے روحانی سلسلہ میں ہمارے تمام مشائخ کے نام موجود ہیں کہ کن حضرات نے کن سے دین سیکھا؟ پھر ان سے کن حضرات نے دین سیکھا؟

بے استاد بے بنیاد:

بھئی! دین تو سیکھنے سے ہی آتا ہے۔ خود بخود تو نہیں آجاتا۔ عجیب بات ہے کہ آج کے زمانے میں انٹرنیٹ سے دین سیکھتے ہیں۔ اور کئی لوگوں کو تو سنا سنایا دین ہوتا ہے۔ ان کا استاد کوئی نہیں ہوتا۔ ادھر سے بات سن لی، ادھر سے بات سن لی، اخبار سے خبریں پڑھ لیں اور یہیں سے دین سمجھ لیا

ہر آں کارے کہ بے استاد باشد یقین دانی کہ بے بنیاد باشد

''ہر وہ کام جو بے استاد ہوتا ہے، سمجھ لو کہ وہ بے بنیاد ہوتا ہے۔''

کیا تصوف بدعت ہے؟

آج کچھ لوگ بڑے آرام سے کہہ دیتے ہیں کہ تصوف بدعت ہے۔ بھئی! یہ بدعت کہاں ہے، یہ تو روحانی بیماریوں کا علاج ہے۔ شریعت نے کہا کہ اگر تمہارے اندر تکبر ہوگا تو تمہیں جنت میں داخلہ نصیب نہیں ہو سکے گا۔ اب بتائیں کہ یہ تکبر کیسے ختم کریں؟ جو محنت تکبر ختم کرنے کا طریقہ بتائے وہ کہاں بدعت بن گئی۔

روحانی بیماریوں کے قرآنی نسخے:

ہاں! علما ومشائخ نے قرآن وحدیث پر غور کر کے وہاں سے کچھ اعمال نکالے اور ہمیں نسخہ دے دیا کہ اس نسخے پر عمل کرلو، تمہیں روحانی شفا نصیب ہوجائے گی۔ ان اعمال کا ماخذ اور مبدا قرآن عظیم الشان اور نبی علیہ السلام کا فرمان ہے۔ مثال کے طور پر جب کوئی بندہ ہمارے سلسلہ میں بیعت ہوتا ہے تو اس سے کہتے ہیں کہ یہ چھ اعمال کرنا شروع کردو۔ ان کو ہم معمولات کا نام دیتے ہیں۔ ان سب معمولات کا حکم قرآن مجید کے اندر موجود ہے۔ ہمارے مشائخ نورِ ایمان کے ذریعے ان کو پہچانا اور یہ ہیرے موتی نکال کر ہمیں دے دیے۔ اب ذرا ان کی تفصیل سنیے۔

(۱) ایک تو ان کو یہ کہا جاتا ہے کہ سو مرتبہ صبح اور سو مرتبہ شام درود شریف پڑھو۔ اب نبی علیہ السلام پر درود شریف پڑھنے کا حکم قرآن مجید میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (الاحزاب:56) اب بتائیں کہ 'صَلُّوا' کون سا صیغہ ہے؟ امر کا صیغہ ہے۔ اللہ تعالیٰ حکم فرمارہے ہیں۔ چنانچہ جو بندہ صبح اور شام درود شریف پڑھے گا وہ تو قرآن مجید کے حکم پر عمل کررہا ہوگا۔

(۲) صبح اور شام سو سو مرتبہ استغفار پڑھنے کو کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں استغفار پڑھنے کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا (نوح:10)

یہاں ''اِستَغفِرُوْا'' کون سا صیغہ ہے؟ امر کا صیغہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ استغفار کرو۔ اگر کسی کو کہہ دیا جائے کہ صبح وشام استغفار کیا کرو تو یہ کہاں سے بدعت آگئی۔ بھئی! یہ تو منشائے قرآن پر عمل ہے۔

(۳) قرآن مجید کی تلاوت کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے۔قرآن مجید میں تلاوت کرنے کا بھی حکم ہے۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

فَاقْرَءُوْا مَاتَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ(المزمل:20)

بتائیں یہ ''اِقرَءُوْا'' کون سا صیغہ ہے؟ امر کا صیغہ ہے۔کیا ہمیں اس آیت پر عمل کرنا چاہیے؟ اگر کسی کو کہا جائے کہ ایک پارہ یا آدھا پارہ روزانہ تلاوت کیا کرو تو یہ قرآن کی منشا پر عمل ہوا، بدعت تو نہ بنی۔

(۴).....چلتے پھرتے، لیٹے بیٹھے، ہر وقت اللہ کا دھیان رکھنے کو کہا جاتا ہے۔یہ بھی حکم خدا ہے۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ (النسآء:103)

یہ ''اُذْکُرُوا'' کون سا صیغہ ہے؟ امر کا صیغہ ہے۔اللہ کا حکم ہے کہ کھڑے ہوئے بھی، بیٹھے ہوئے بھی اور لیٹے ہوئے بھی اللہ کو یاد کرو۔اب اگر کسی کو یہ کہا جائے کہ تم وقوف قلبی رکھو، یعنی لیٹے، بیٹھے، کھڑے اللہ کو یاد رکھو، تو یہ قرآن کی منشا پر ہی عمل ہوگا۔

(۵) ہمارے مشائخ فرماتے ہیں کہ ذکر قلبی (مراقبہ) کرو۔اس ذکر قلبی کا بھی قرآن مجید میں حکم ہوا ہے۔وہ کیسے؟ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ(الاعراف:205)

''اور ذکر کر اپنے رب کا اپنے نفس میں''

مفسرین نے لکھا: اَی فِی قَلبِكَ ''اپنے دل میں اپنے رب کو یاد کرو'' کیسے یاد کریں؟ آگے فرمایا:

تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً (الاعراف:205)

''گڑگڑاتے ہوئے، بہت خفیہ انداز سے۔''

تفسیر معارف القرآن میں حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں کہ'' تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً (الاعراف:205)'' کے الفاظ سے قرآن مجید سے ذکر قلبی کا ثبوت ملتا ہے۔

یہاں ''و اذکر'' بھی امر کا صیغہ ہے۔ چنانچہ اگر کسی کو کہا جائے کہ قرآن مجید کی اس آیت پر عمل کرو تو یہ کہاں سے بدعت بن جائے گا۔

(۶) چھٹے نمبر پر بتایا جاتا ہے کہ مشائخ کی صحبت اختیار کرو۔ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے کا حکم بھی قرآن مجید میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبہ:119)

یہ ''کُونُوا'' بھی امر کا صیغہ ہے۔ تو جو لوگ مشائخ کی صحبت اختیار کرتے ہیں وہ بھی منشائے قرآنی پر عمل کر رہے ہوتے ہیں۔

اگر ان چھ اعمال کے بارے میں کسی کو کہہ دیا جائے تو یہ کہاں سے بدعت بن جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ان اعمال کو بدعت کہتے ہیں، وہ یا تو جاہل ہیں یا متجاہل ہیں۔ عالم ہوتے تو کبھی بدعت نہ کہتے۔ پتا چلا کہ یہ بھی منشائے قرآنی پر ہی عمل ہے۔ یاد رکھیں! ہمارے مشائخ نے اپنے پاس سے کچھ نہیں کیا، ان اعمال کو قرآن وحدیث سے لے کر بتا دیا کہ بھئی! تم اس پر عمل کرو۔ پھر اللہ تعالیٰ ان میں برکت رکھ دیتے ہیں اور بندے کو شفا مل جاتی ہے۔

آپ ان چھ معمولات کو باقاعدگی سے کر کے دیکھیں، آپ کو اپنی زندگی میں واضح فرق نظر آئے گا۔ آپ کا اپنا دل گواہی دے گا کہ ہاں! اب میرے دل میں اللہ کی محبت پہلے کی نسبت بڑھ گئی ہے۔

روحانی بیماریوں کی حقیقت:

ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی یہ روحانی بیماریاں ہوتی ہیں؟اس کا جواب یہ ہے کہ جی ہاں!روحانی بیماریاں ہوتی ہیں۔اس کی دلیل قرآن عظیم الشان سے ۔اللہ تعالیٰ ایک جگہ پر ارشاد فرماتے ہیں کہ اے نبی علیہ السلام کی بیویو!پردے میں رہو،ایسا نہ ہو کہ

فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ(الاحزاب:32) ''کہ تمہیں دیکھ کر طمع کرے وہ بندہ جس کے اندر بیماری ہے۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید سے ثابت ہو رہا ہے کہ جب غیر عورت کو دیکھ کر کسی کے دل میں طمع پیدا ہوتا ہے اور شہوت اٹھتی ہے تو یہ ایک بیماری ہوتی ہے۔قرآن کہہ رہا ہے کہ'' فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ(الاحزاب:32)۔

اب اگر ایک بندہ نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکلتا ہے اور اس کے لیے آنکھ پر کنٹرول کرنا مشکل ہوتا ہے، ادھر بھی عورت کو چلتے دیکھتا ہے اور ادھر بھی دیکھتا ہے تو بھئی!یہ تو کنفرم ہو گیا کہ اندر روگ ہے۔ہم لوگوں کو تو دھوکہ دے سکتے ہیں لیکن رب کو تو دھوکہ نہیں دے سکتے، ہمارا رب تو جانتا ہے نا، کہ یہ ادھر بھی دیکھتا ہے اور ادھر بھی دیکھتا ہے۔

☆ ہوائی جہاز پر سفر کرتے ہوئے ائیر ہوسٹس کو دیکھتے ہیں یا نہیں۔

☆ بسوں اور ویگنوں میں سفر کرتے ہوئے مسافر عورتوں کو دیکھتے ہیں یا نہیں۔

☆ راستہ چلتے ہوئے ادھر ادھر دیکھتے ہیں یا نہیں۔

☆ دکاندار صاحب آنے والی گاہک عورتوں کو دیکھتے ہیں یا نہیں۔

اگر ہوس بھری نظر اٹھتی ہے اور پیچھا کرتی ہے تو یہ کنفرم ہو گیا کہ روحانی بیماری ہے۔ اب اگر روحانی بیماری کی کنفرمیشن بھی ہو اور بندہ علاج نہ کروائے تو پھر وہ تو قابل رحم ہوگا۔ بلکہ اطبا کہتے ہیں کہ سب سے بڑا مریض بھی وہ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو مریض نہ سمجھے۔ چنانچہ جن لوگوں کو ہیپا ٹائٹس سی کی بیماری ہوتی ہے اور وہ اپنا علاج نہیں کرواتے کہ ٹھیک ہو جائیں گے، آپ دیکھیں گے کہ چند مہینوں کے اندر ان کے جسم کے اعضا سکڑ جاتے ہیں، جن پر اثر ہوتا ہے، بالآخر وہ بندہ موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔

یہی مثال روحانی بیماری کی بھی ہے کہ جب سمجھتا ہے کہ میری آنکھ پاک نہیں، اور پھر علاج نہیں کرواتا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ بے ایمان مرنے کے لیے تیار ہے۔ کیونکہ علما نے لکھا ہے کہ بدنظری کے بڑے نقصانات ہیں۔ ان میں سے ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ موت کے وقت بندہ کلمے سے محروم ہو جاتا ہے۔ جو لوگ موت کے وقت کلمے سے محروم ہوتے ہیں ان میں سے اکثر وہ ہوتے ہیں جو بدنظری کے مرتکب ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں نے اپنے حضرتؒ سے یہ سوال پوچھا: حضرت! گناہ تو اور بھی بڑے ہیں، لیکن یہ بدنظری اتنا بڑا گناہ ہے کہ انسان ایمان سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ ذہن میں ایک دو واقعات بھی تھے۔ جنید بغدادیؒ کا ایک مرید جا رہا تھا۔ وہ حافظ قرآن تھا۔ اس کی نظر ایک خوب صورت لڑکے پر پڑی تو وہ پوچھنے لگا: حضرت! ایسے حسین لوگ بھی جہنم میں جائیں گے؟ حضرت نے فرمایا: تو نے بری نظر ڈالی ہے، توبہ کر لے۔ اس نے جواب دیا: حضرت! نہیں نہیں، میں نے تو ایسے ہی کہا ہے۔ بہانہ کر دیا۔ ابن جوزیؒ فرماتے ہیں کہ اس پر اس بدنظری کا اتنا وبال پڑا کہ بیس سال کے بعد قرآن اس کے سینے سے نکل گیا اور وہ قرآن مجید بھول گیا۔

ابن جوزیؒ ایک اور بھی واقعہ نقل کرتے ہیں کہ مؤذن اذان دینے کے لیے مینارے پر چڑھا اور ہمسائے

کے گھر میں نظر پڑی۔ان کی ایک جوان لڑکی تھی۔ایک بدنظری کا ایسا اثر ہوا کہ بالآخر ایمان سے محروم ہو گیا۔یہ واقعات بندے کو ڈراتے ہیں۔اس لیے اس عاجز نے یہ سوال کیا اور عرض کیا: حضرت! بدنظری کے ان واقعات کو پڑھ کر تو بڑا ڈر لگتا ہے، کیا یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ بندہ ایمان سے ہی محروم ہو جاتا ہے دیکھو! قتل کرنے والے کو ایمان سے محروم نہیں کیا گیا، چوری کرنے والے کو محروم نہیں کیا گیا، لیکن بد نظری کرنے والے کو ایمان سے محروم ہونے کا کہا گیا۔

حضرتؒ نے فرمایا: ہاں! اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ اللہ رب العزت کی غیرت کا معاملہ ہے۔ چونکہ انسان غیر کی طرف للچائی نظر سے دیکھتا ہے، اس لیے اللہ کو غیرت آتی ہے کہ ارے! تو حسن دینے والے کو بھول گیا اور حسن کے پیچھے دیوانہ بن گیا۔میری طرف سے تو نے نظریں ہٹا لیں اور مخلوق کے اوپر نظریں جما لیں۔اللہ رب العزت کی یہ غیرت برداشت نہیں کرتی۔آپ ذرا غور کریں کہ بیوی سب کچھ برداشت کر جاتی ہے لیکن مرد اگر کسی غیر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے تو بیوی کو برداشت نہیں ہوتا۔یہی اللہ رب العزت کا معاملہ ہے۔نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

اَنَا اَغْیَرُ وُلِدَ اٰدَمُ وَاللّٰہُ اَغْیَرُ مِنِّیْ

''میں انسانوں میں سے سب سے زیادہ غیور ہوں اور اللہ رب العزت مجھ سے بھی زیادہ غیور ہیں''

اس لیے یہ بدنظری بہت بڑا گناہ بن جاتی ہے۔نظر نہیں آتا۔لیکن یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ انسان کا من بیمار ہے۔اب جب بیمار ہے تو پھر علاج کروائے۔

باطنی بیماری ہونے کی ایک اور دلیل بھی ہے۔جب ہم نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو اس نماز میں ہمارا دھیان نماز کی طرف ہوتا ہے یا دنیا کی طرف ہوتا ہے؟ اپنا دل گواہی دے گا۔اگر تکبیر تحریمہ یعنی

شروع میں اللہ اکبر کہنے سے سلام پھیرنے تک اللہ تعالیٰ کا دھیان رہتا ہے اور اَنْ تَعْبُدُ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَـــرَاهُ والی کیفیت ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ من سنورا ہوا ہے، اور اگر کھڑے ہوتے ہی پچھلے قصے بھی یاد آنے لگ جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ من بیمار ہے۔ کئی مرتبہ تو دنیا کے کام کاج تو کیا، نماز میں کھڑے ہوتے بندہ گناہوں کے بارے میں سوچ رہا ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ اس عاجز نے کسی شہر میں نماز کے عنوان پر بیان کیا تو بعد میں ایک عالم وہیں پر ملنے کے لیے آئے۔ ان کی بھنویں اور داڑھی سفید تھی۔ کہنے لگے: میں پچھلے چھبیس سال سے بخاری شریف پڑھا رہا ہوں اور جیسی نماز کے بارے میں آپ نے بیان کیا، مجھے زندگی میں ایسی ایک نماز بھی نصیب نہیں ہوتی۔

خیر! ان کو اس کے بارے میں بتایا اور سمجھایا، ساتھی بتانے لگے کہ یہ فلاں جگہ پر غیر مقلدوں کا جو مدرسہ ہے اس میں بخاری شریف کے شیخ الحدیث ہیں۔ اب اندازہ کریں کہ وہ شیخ الحدیث جو چھبیس سال سے بخاری شریف پڑھا رہے ہیں وہ خود فرماتے ہیں کہ مجھے ایک نماز بھی ایسی نصیب نہیں ہوئی۔

میں نے جواب میں ان سے پوچھا: کیا آپ نماز سیکھنے کے لیے کسی کے پاس گئے ہیں؟ کہنے لگے: میں گیا تو نہیں ہوں۔ میں نے کہا: پھر تم تصوف کو کیوں بدعت کہتے ہو؟ کیوں مخالفت کرتے ہو تصوف کی؟ من کی صفائی کے طریقے کو بدعت کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ آؤ نا، اللہ والوں کی صحبت میں چند دن رہو اور دیکھو، کیسے تمہاری نماز بنتی ہے۔ کیسے دل میں اللہ کی محبت بڑھتی ہے۔ ایسی محبت نصیب ہوگی کہ آپ تہجد کی نیت باندھیں گے تو سجدے سے سر اٹھانے کو دل نہیں کرے گا۔ ہمارے مشائخ ایسی نمازیں پڑھتے تھے۔ چنانچہ اگر جسمانی بیماریوں کا علاج کروانا ضروری ہے تو روحانی بیماریوں کا علاج کروانا اس

سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ایسا نہ ہو کہ انسان ایمان سے محروم ہو جائے۔

فقہ الظاہر اور فقہ الباطن:

شریعت نے کچھ کام کرنے کا حکم دیا ہے اور کچھ کام نہ کرنے کا حکم دیا ہے۔جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے ان کو ''مامورات'' کہتے ہیں اور جن کاموں کو نہ کرنے کا حکم دیا ہے ان کو ''منہیات'' کہتے ہیں۔

اب مامورات میں دو طرح کے احکام ہیں۔بعض کا تعلق ظاہر سے ہے اور بعض کا تعلق باطن سے ہے۔

مثال کے طور پر فرمایا:

نماز پڑھو.....ظاہر سے تعلق

روزہ رکھو.....ظاہر سے تعلق

حج کرو.....ظاہر سے تعلق

زکوٰۃ ادا کرو.....ظاہر سے تعلق

قربانی کرو.....ظاہر سے تعلق

اور کچھ ایسے اعمال ہیں جن کا تعلق باطن سے ہے۔جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

توکل کرو.....اس کا تعلق باطن سے ہے

صبر کرو.....اس کا تعلق باطن سے ہے

شکر کرو.....اس کا تعلق باطن سے ہے

اس لیے کہ یہ چیزیں بندے کو نظر تو نہیں آتیں۔یہ تو من کی کیفیتوں کے نام ہیں۔

اسی طرح منہیات کا معاملہ ہے۔ان میں بھی دو طرح کے اعمال ہیں۔بعض کا تعلق ظاہر سے ہے اور بعض کا تعلق باطن سے ہے۔مثلاً شریعت نے کہا: چوری نہ کرو،شراب نہ پیو،قتل نہ کرو،زنا نہ کرو۔ان

تمام کا تعلق ظاہر سے ہے اور شریعت نے ان سے منع کیا ہے۔اور شریعت کی کچھ منع کردہ باتوں کا تعلق باطن سے ہے۔مثلاً فرمایا:

☆ حسد نہ کرو۔اب بتائیں کہ کیا کسی کو آنکھ سے حسد نظر آتا ہے۔آنکھ سے تو نظر نہیں آتا۔اللہ ہی جانے کسی کے دل میں کیا ہے۔

☆ دل میں کینہ نہ رکھو۔کیا پتہ کے کس کے دل میں کینہ بھرا ہوا ہے۔اس کو پنجابی میں ''وٹ رکھنا'' کہتے ہیں۔اپنے دل میں کسی کے بارے میں بَیر رکھنا۔اس کو شریعت میں کینہ کہتے ہیں۔

☆ تکبر سے بچو۔یہ باطنی بیماری بھی نظر نہ آنے والی چیز ہے۔

یہ سب کے سب باطن کے وہ اعمال ہیں جن سے شریعت نے منع کیا ہے۔

وہ تمام مامورات یا منہیات جن کا تعلق ظاہر سے بنتا ہے ان کو شریعت کی نظر میں فقہ کہتے ہیں۔یہ فقہ الظاہر ہے۔اور وہ تمام مامورات یا منہیات جن کا تعلق باطن سے ہے ان تمام کے علم کو تصوف کہتے ہیں۔اور یہ فقہ الباطن ہے۔

تزکیہ نفس کی اہمیت:

ان سب کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے من کی بیماریاں ختم ہو جائیں۔اگر کپڑے میں میل ہو تو اس کو دھونا پڑتا ہے۔اس کا ایک طریقہ کار ہے۔پانی لگاؤ،صابن لگاؤ،اس کو نچوڑو۔اس سے میل ختم ہو جاتی ہے۔اسی طرح انسان کے من میں بھی گناہوں کی میل آجاتی ہے۔ان گناہوں کی میل کو صاف کرنے کا نام ''من کی صفائی'' ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس تزکیہ نفس کی اہمیت قرآن مجید میں بیان فرمادی ہے۔چنانچہ ارشاد فرمایا:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (الاعلیٰ:14) ”تحقیق فلاح پا گیا وہ جو ستھرا ہوا“

تو جو بندہ بھی اپنے من سے میل ختم کرے گا وہ فلاح پائے گا۔ بلکہ قرآن مجید میں ایک جگہ پر سات مرتبہ قسمیں کھا کر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنے من کو صاف کرنے والا فلاح پائے گا۔ آپ غور کریں کہ ایک معتمد بندے کا ایک مرتبہ قسم کھا لینا کافی ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ دو مرتبہ قسم کھائے، تین مرتبہ قسم کھائے، اللہ تعالیٰ نے ایک ہی دم میں سات مرتبہ قسمیں کھائیں۔

وَ الشَّمْسِ وَضُحٰهَا (الشمس:1) ایک قسم

وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا (الشمس:2) دوسری قسم

وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا (الشمس:3) تیسری قسم

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا (الشمس:4) چوتھی قسم

وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا (الشمس:5) پانچویں قسم

وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا (الشمس:6) چھٹی قسم

وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰهَا (الشمس:7) ساتویں قسم

پھر آگے فرمایا:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا ○ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ○ (الشمس:9-8)

سات قسمیں کھا کر ارشاد فرمایا کہ جو اپنے نفس کو ستھرا کر لے گا وہ کامیاب ہو جائے گا۔ اب ہمیں اس کی اہمیت کا اندازہ لگانا چاہیے کہ یہ من کی صفائی کتنی ضروری ہوتی ہے۔

نفس کا تزکیہ کرنا، یہ بعثت کے مقاصد میں سے ہے۔اسی لیے جب نبی علیہ السلام تشریف لائے تو آپ کی بعثت کے چار مقاصد بیان کرتے ہوئے اس کے بارے میں فرمایا:

وَ یُزَكِّیْهِمْ (البقرہ:129)

''آپ ان کا تزکیہ فرمائیں گے اور آپ ان کو ستھرا فرمائیں گے۔''

اس سے بھی بات سمجھ میں آتی ہے کہ واقعی انسان کو اپنے من کی صفائی کے لیے محنت کرنی چاہیے اور تزکیہ نفس حاصل کرنے کے لیے کوشش میں لگے رہنا چاہیے۔

تصوف ایک حقیقت ہے:

اسی بات کو ایک اور زاویے سے آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں:

ایک تھیں تعلیماتِ نبوی اور ایک تھیں کیفیاتِ نبوی۔تعلیماتِ نبوی ﷺ کو ''علم شرائع'' (شرع کا علم) کہتے ہیں۔اور کیفیاتِ نبوی ﷺ کو ''علم الاحسان'' کہتے ہیں۔اسی علم الاحسان کا دوسرا نام تصوف ہے۔بھئی! ہم اگر اس کو تصوف کہتے ہیں اور آپ کو اس نام سے چڑ ہے تو آپ اس کو تزکیہ کہہ دیں یا علم الاحسان کہہ لیں، یہ تو قرآن وحدیث کے الفاظ ہیں۔اللہ تعالیٰ اس کا تذکرہ قرآن مجید میں یوں فرماتے ہیں:

وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (ال عمرن:134)

''اور اللہ تعالیٰ محسنین سے محبت فرماتے ہیں''

آپ اپنی پسند کا نام دے لیں۔بھئی! جو اللہ چاہتے ہیں وہی نام مشہور ہو جاتے ہیں۔اسی طرح ''تصوف'' نام بھی شہرت پا گیا ہے۔ورنہ شروع میں اس کو علم الاحسان ہی کہتے تھے۔''تزکیہ کا علم'' ہی

کہتے تھے۔ارے! ناموں سے کیا ہوتا ہے، اصل میں تو حقیقت کو دیکھا جاتا ہے۔ایک آدمی کسی چیز کو ''A'' کہے۔ دوسرا ''B'' کہے اور تیسرا ''C'' کہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ چیز تو وہی ہوتی ہے جو ہے۔تو تصوف ایک حقیقت ہے جس کو مانے بغیر چارہ ہی نہیں۔

نماز، سیکھ کر پڑھیے:

ایسے بندے کو کبھی بھی حضوری کی نماز نصیب نہیں ہوتی جو تصوف کا مخالف ہو۔نمازیں تو پڑھتا ہے، مگر نفس کے خیالات کے ساتھ پڑھتا ہے۔اب اگر ایسی ہی نمازیں اللہ کے حضور بھیجنی ہیں تو پھر آدمی کی اپنی مرضی کی بات ہے۔ورنہ کم از کم سیکھنے کی کوشش تو کرنی چاہیے۔

حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ حضرت سید احمد شہیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: حضرت! میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ مجھے ایک نمازِ صحابہ جیسی پڑھا دیجیے۔یہ ہے بیعت کا اصل مقصد.....کیا ہی خوب صورت بات کہی۔چنانچہ حضرتؒ فرمایا: بہت اچھا۔

رات کو وہاں قیام کیا۔جب رات کا آخری پہر ہوا تو حضرت نے نام لے کر پکارا: اٹھ گئے ہو؟ عرض کیا: جی حضرت! اٹھ گیا ہوں۔فرمایا: جاؤ! اللہ کے لیے وضو کر کے آؤ۔حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جب یہ فرمایا کہ اللہ کے لیے وضو کر کے آؤ۔ پتہ نہیں اس لفظ نے میرے دل پر کیا اثر کیا کہ میرے اوپر اللہ تعالیٰ کی ذات کا استحضار شروع ہو گیا کہ میں اللہ کے سامنے ہوں۔اب وضو بھی کر رہا ہوں اور آنکھوں سے آنسو بھی نہیں تھمتے۔

جب وضو کر کے آیا تو عرض کیا: حضرت! میں وضو کر کے آ گیا ہوں۔فرمایا: جاؤ! اللہ کے لیے دو رکعت پڑھ لو۔کہتے ہیں کہ اللہ کے لفظ میں کیا اعجاز تھا کہ میں نے نماز کی نیت باندھی۔پھر نیت باندھنے سے لے کر سلام پھیرنے تک مجھے اپنا ہوش بھی نہ رہا۔یہی استحضار تھا کہ میں اپنے رب کے سامنے

ہوں۔فرماتے ہیں کہ زندگی میں میں نے ایسی نماز نہیں پڑھی تھی۔ہمارے مشائخ ایسی نمازیں پڑھتے تھے۔

ایک بزرگ تھے۔ان سے کسی نے پوچھا:حضرت ! آپ کو نماز میں دنیا کا خیال آتا ہے؟فرمانے لگے:نہ نماز کے اندر آتا ہے اور نہ نماز کے باہر آتا ہے۔اس تزکیہ کا یہ فائدہ ہے کہ انسان پھر ایسی نمازیں پڑھتا ہے۔

ہمارے دل میں بھی تو یہ تمنا ہونی چاہیے کہ ہم بھی زندگی میں دو رکعتیں ایسی پڑھ جائیں کہ ان میں اللہ اکبر سے لے کر سلام پھیرنے تک اللہ کے سوا کسی کا خیال نہ آئے۔دل میں حسرت اور تمنا بھی ہو اور انسان اس کے لیے کوشش بھی کرے۔یاد رکھیں !بغیر صحبت کے ہزاروں بار ایسی نمازیں پڑھنے کی کوشش کریں گے مگر یہ کیفیت نصیب نہیں ہوگی۔کچھ نوجوانوں نے بتایا:حضرت !ایک دفعہ ہم نے یہ کوشش کی کہ ہم نے نماز میں کچھ نہیں سوچنا،اور پوری نماز میں یہی سوچتے رہے کہ کچھ نہیں سوچنا۔نفس اور شیطان انسان کے ایسے دشمن ہیں۔تو کوشش کرنی چاہیے کہ حضوری والی نماز نصیب ہو جائے اور میرے آقا ﷺ پر احسان کی جو کیفیت تھی اس کی ایک جھلک نصیب ہو جائے۔

نبی علیہ السلام سیدنا بلال ؓ کو فرمایا کرتے تھے:

اَرِحنِی یَابِلَال!''اے بلال!میری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاؤ(یعنی اذان دے دو)''

سیدہ عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں:نبی علیہ السلام ہمارے درمیان میں ہوتے تھے۔ہم باتیں کر رہے ہوتے تھے۔اچانک مسجد سے اذان کی آواز آتی تھی اور اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ ایسے ہو جاتے تھے کہ جیسے مجھے پہچانتے ہی نہیں۔میں سامنے آتی تھی تو فرماتے تھے:مَن اَنتِ''تو''کون ہے؟''۔میں کہتی:میں

ابوبکرؓ کی بیٹی ہوں۔ پھر پوچھتے: مَن اَبُوبکر ؟ ''ابوبکر کون ہیں؟''۔ اس سے میں سمجھ جاتی تھی کہ اذان کی آواز سن کر میرے آقا ﷺ پر اللہ کی محبت کا ایسا غلبہ ہوگیا ہے کہ اب وہ کسی کو نہیں پہچانیں گے جب تک نماز نہ پڑھ لیں۔

علم الشرائع اور علم الاحسان:

تعلیماتِ نبوی نبی اکرم ﷺ کی مبارک زبان سے صادر ہوئیں، ان کو صحابہؓ نے اپنے کانوں سے سنا اور پھر ان سے یہ علم حدیث کی شکل میں آگے چلا۔ اس کو علم الشرائع کہتے ہیں۔ اور جو کیفیات نبوی تھیں وہ صحابہؓ نے آپ ﷺ کی صحبت میں بیٹھ کر سیکھیں۔ وہ دل سے دل میں منتقل ہوئیں، ان کو ''علم الاحسان'' کہتے ہیں۔ اب اگر کوئی یہ پوچھے کہ یہ کیفیات کہاں سے آگئیں تو یہ روایت ان کے لیے مینارہ نور ثابت ہوگی۔

نفاق کا ڈر:

حضرت حنظلہؓ گھر میں بیٹھے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ میرے دل کی جو حالت میرے آقا ﷺ کے صحبت میں ہوتی ہے، گھر میں بیوی بچوں کے درمیان وہ حالت نہیں ہوتی۔ بس یہی سوچ کر کہنے لگے: نـــافـــق حنظلہ، نافق حنظلہ۔ ''حنظلہ منافق ہوگیا، حنظلہ منافق ہوگیا۔'' چنانچہ وہ نبی علیہ السلام کی خدمت میں چل پڑے۔

راستے میں صدیق اکبرؓ سے ملاقات ہوگئی۔ پوچھا: حنظلہ! کہاں جارہے ہو؟ جواب میں اپنے بارے میں کہنے لگے: حنظلہ تو منافق ہوگیا ہے۔ پوچھا: کیسے؟ کہنے لگے: جو کیفیت نبی علیہ السلام کی صحبت میں ہوتی ہے وہ گھر میں نہیں ہوتی۔ صدیق اکبرؓ نے فرمایا: بھئی! یہ حالت تو ہماری بھی ہے۔ آؤ! چلتے ہیں اور

نبی علیہ السلام سے پوچھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جب نبی علیہ السلام سے پوچھا تو نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: حنظلہ ! تمہاری یہ کیفیت اگر ہر وقت رہے تو راستے میں اللہ کے فرشتے اتر کر تمہارے ساتھ مصافحہ کریں۔

ایک سوال کا دلچسپ جواب:

اب یہاں طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا گھر میں ان کا ایمان کم ہوتا تھا اور نبی علیہ السلام کی صحبت میں پورا ہو جاتا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ ایمان تو پورا ہی ہوتا تھا مگر اس ظاہری فرق کی ایک وجہ تھی۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیں۔ سمندر کے اوپر کچھ دن ایسے ہوتے ہیں جب اس کی سطح بالکل خاموش ہوتی ہے۔ پانی میں کوئی مدو جزر نہیں نظر آتی۔ اور جب چودھویں کی رات کا چاند پورا ہوتا ہے تو ہائی ٹائیڈ کا وقت آجاتا ہے۔ وہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ پانی کی لہریں پچیس پچیس فٹ یا پچاس پچاس فٹ تک اچھل اچھل کر پڑ رہی ہوتی ہیں۔ بھئی! سمندر کا پانی بڑھ تو نہیں گیا۔ سمندر میں ہیجان آ گیا ہے۔ سمندر کے اندر مدو جزر آ گئی ہے۔ صحابہؓ کے ایمان کی یہی کیفیت تھی۔ گھر میں جاتے تھے تو ایمان کا لیول پرسکون نظر آتا تھا اور میرے آقا ﷺ کی خدمت میں آتے تھے تو اس ماہتاب نبوت کے سامنے ان کے ایمان کے سمندر میں مدو جزر آجاتی تھی۔ اللہ والوں کی صحبت میں بھی یہی ہوتا ہے کہ انسان ان کی صحبت میں آتا ہے تو اس کو اپنے ایمان کے اندر ایک حرارت محسوس ہوتی ہے۔

فقہ اور تصوف کے امام:

علم الشرائع سکھانے والوں کو علمائے کرام کہتے ہیں اور جو علم الاحسان سکھاتے ہیں ان کو مشائخ کرام کہتے ہیں۔ کتاب وسنت پر غور وخوض کر کے جنہوں نے جنہوں نے مسائل کا استنباط کیا ان کو فقہ کا امام

کہتے ہیں۔وہ اپنے وقت کے ائمہ مانے گئے۔محدثین نے ان کی پیروی کی۔محدثین نے ان کے قول پر عمل کیا۔کیوں؟اس لیے کہ وہ فقہا تھے۔انہوں نے قرآن وحدیث کے سمندروں میں غوطے لگا کر ہیرے اور موتی نکالے اور علما کے سامنے پیش کیے۔یہ استنباط شریعت کے عین مطابق تھا۔قرآن مجید میں باقاعدہ لفظ ہے۔فرمایا:یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ (ال عمرن:83) کہ یہ اہل علم کے پاس آئے تو وہ اس بات کا استنباط کر لیتے ہیں۔اور جنہوں نے علم الاحسان میں غور وخوض کر کے روحانی بیماریوں کے علاج کے جوابات نکالے ان کو بھی اپنے وقت میں تصوف کا امام اور مشائخ کہا گیا۔

رنگ،رنگ فروش اور رنگ ریز:

کتاب وسنت رنگ ہے اور علماء رنگ فروش ہیں۔جو ان کے پاس آتا ہے اس کو اس رنگ کے بارے میں پوری تفصیلات بتا دیتے ہیں،بلکہ رنگ ہی دیتے ہیں۔لیکن ایک ہوتا ہے،رنگ ریز۔رنگ چڑھانے والا۔جی ہاں!رنگ اور ہوتا ہے،رنگ فروش اور ہوتے ہیں اور رنگ چڑھانے والے اور ہوتے ہیں۔بازاروں میں رنگ ریزوں کی دکانیں ہوتی ہیں۔آپ کوئی کپڑا لے کر جائیں اور کہیں کہ یہ رنگ چڑھا دیں تو وہ وہی رنگ چڑھا دیتے ہیں۔چنانچہ

کتاب وسنت رنگ ہے

علمائے کرام رنگ فروش ہیں

مشائخ عظام رنگ ریز ہیں۔

جو بندہ بھی مشائخ عظام کی صحبت میں آتا ہے وہ اس کے دل پر اللہ کا رنگ چڑھا دیتے ہیں۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (البقرہ:138)

''اللہ کا رنگ، اور اللہ کے رنگ سے بہتر کوئی رنگ نہیں ہوتا۔''

''اہلِ ذکر'' سے رابطہ رکھنے کا حکم:

ہمیں علما اور مشائخ دونوں سے رابطہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہمیں حکم دیا گیا کہ علما سے تعلق جوڑ کر علم الشرائع سیکھیں اور مشائخ سے تعلق جوڑ کر باطن کا علم سیکھیں۔ قران مجید میں فرمایا:

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (الانبیآء:7)

''اگر تم نہیں جانتے تو پھر اہل علم سے پوچھ لو۔''

یہاں علما نے اہل ذکر سے مراد اہل علم لکھا ہے۔ بتائیں! فَسْئَلُوْا (الانبیآء:7) کون سا صیغہ ہے؟ امر کا صیغہ ہے۔ اس کا مطلب یہی نکلا کہ علما سے رابطہ رکھو، ان سے دین سیکھو اور ان سے شریعت کے احکام سیکھو۔ ہم میں سے ہر بندے کو حکم ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی فرمایا:

اِتَّقُوْا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبہ:119) ''اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔''

بتائیں! كُوْنُوْا کون سا صیغہ ہے؟ امر کا صیغہ ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مشائخ کی صحبت میں بیٹھنے کا حکم ہے۔ اگر ہم مدارس میں بیٹھیں گے تو ہم شریعت کا علم سیکھیں گے اور اگر مشائخ کے پاس خانقاہوں میں بیٹھیں گے تو باطن کا علم سیکھیں گے۔ البتہ کچھ ایسی بھی شخصیتیں ہوتی ہیں جو مرج البحرین ہوتی ہیں۔ اللہ رب العزت ان کو علم ظاہر اور علم باطن دونوں عطا فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے بہت سے ایسے مشائخ گزرے جو ظاہر میں بھی جبال علم میں سے تھے۔ مثلاً: حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مدنیؒ اور یہ ساری کی ساری شخصیتیں عین اسی

وقت علم باطن کے بھی امام تھے اوران کی باطنی پرواز بہت بلند تھی۔تو جہاں ظاہر کی تعلیم دی جاتی ہے اس جگہ کو ''مدرسہ'' کہا جاتا ہے اور جہاں باطن کی تعلیم دی جاتی ہے اس کو ''خانقاہ'' کہا جاتا ہے۔

علوم شرعیہ اور تصوف میں چار چار امام کیوں؟

یہ اللہ رب العزت کا تکوینی معاملہ ہے کہ

☆اللہ رب العزت نے اس دنیا میں اپنی چار کتابیں نازل فرمائیں۔زبور،تورات،انجیل اور قرآن مجید۔

☆اسی طرح نبی علیہ السلام کے چار خلفائے راشدین ہیں۔ابو بکر وعمر،عثمان وعلی رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

☆اس سے آگے بھی اللہ رب العزت نے مہربانی کی کہ علم الشرائع میں بھی یوں تو درجنوں ائمہ سے فقہ کا آغاز ہوا۔امام اوزاعیؒ کی اقتدا ہوئی،سفیان ثوریؒ کی اقتدا ہوئی،حمادؒ کی اقتدا ہوئی۔لیکن ان میں سے صرف چار ایسے حضرات تھے جن پر امت مجتمع ہوئی۔امام اعظم ابوحنیفہؒ،امام احمد بن حنبلؒ،امام شافعیؒ،اور امام مالکؒ۔

اگر یہاں کوئی یہ سوال کرے کہ دین میں یہ چار ہی امام کیوں ہیں؟ تو اس کا جواب یوں دیا جاسکتا ہے کہ اگر کسی کے ایک درجن بیٹے ہوں اور ایک ایک کر کے وہ مرتے رہیں اور باقی چار رہ جائیں تو میراث کتنے بیٹوں میں تقسیم ہوگی؟ چار بیٹوں میں تقسیم ہوگی نا۔اب اگر کوئی یہ پوچھے کہ یہ چار ہی میں کیوں تقسیم ہوگی تو کہیں گے: اللہ کی مرضی۔ایسے ہی جو بندہ یہ پوچھے کہ اب چار ہی امام کیوں؟ تو کیا جواب دیں گے؟ جی! اللہ کی مرضی۔یہ تو اللہ کے ہاں قبولیت ہے۔

اسی طرح علم الاحسان میں بھی چار حضرات ایسے تھے جن کو امام کا درجہ ملا۔ان میں سے ایک شیخ عبدالقادر

جیلانیؒ، دوسرے شیخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، تیسرے حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندیؒ، اور چوتھے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ۔ پھران چاروں بزرگوں کے نام پر چار سلسلے مشہور ہو گئے۔

علم الاحسان کا ثبوت:

اگر کوئی یہ پوچھے کہ علم الاحسان کا کہاں سے ثبوت ملتا ہے؟.....علم الشرائع کے بارے میں تو نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَى اللَّحْدِ اور یہ بھی فرمایا: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَةٍ ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ علم کو سیکھنا چاہیے۔ پھر یہ علم الاحسان کہاں سے آ گیا؟

بخاری شریف کی ایک روایت ہے جس کو علما حدیث جبرئیل کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ اس حدیث کے راوی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

ہم نبی علیہ السلام کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک آدمی آیا۔ اس کے کپڑے بھی بڑے سفید تھے اور بال بھی بڑے کالے تھے۔ کوئی گرد وغیرہ کا نام ونشان نہیں تھا.....مٹی وغیرہ کا نام ونشان نہ ہونا اس بات کی دلیل تھی کہ وہ دور سے نہیں قریب سے آیا ہے۔ کیونکہ اگر دور کا سفر کر کے آتا تو اس پر مٹی وغیرہ ہوتی۔ اور درماندگی اور تھکاوٹ کے آثار نظر آتے۔ وہ تو بڑا فریش تھا۔ جب اس طرح سے آیا تو ہمیں محسوس ہوا کہ یہ قریب کا آدمی ہے۔ لیکن اس وقت جتنے بھی لوگ بیٹھے تھے ان میں سے اس کو پہچانتا کوئی بھی نہیں تھا۔ اس سے یہی سمجھ آتی تھی کہ یہ قریب کا نہیں ہے۔ بھئی! کوئی تو پہچانتا کہ یہ کس قبیلے کا ہے اور کس شہر کا ہے، کوئی بھی نہیں پہچانتا تھا۔ کہنے لگے ہم بڑے حیران ہوئے.....وہ آئے اور نبی علیہ السلام کے سامنے اس طرح بیٹھ گئے کہ رُكْبَةَ اِلَى رُكْبَتَيْنِ۔ محبوب ﷺ کے گھٹنوں کے ساتھ اپنے گھٹنے ملا

دیئے.....ماشاءاللہ.....!!!

پھراس نے نبی علیہ السلام سے سوال پوچھا:

مَا الاِیمَان؟ ''ایمان کیا ہے؟''

نبی علیہ السلام نے جواب دیا۔ جب آپ ﷺ نے جواب دیا تو اس نے کہا:

صَدَقْتَ ''آپ نے سچ فرمایا۔''

ہم بہت حیران ہوئے کہ پوچھا اس طرح رہا ہے جیسے پتہ ہی نہیں اور جواب ملنے پر صَدَقْتَ اس طرح کہہ رہا ہے جیسے پہلے ہی اس کو پتہ ہے۔

پھراس نے دوسرا سوال پوچھا:

مَاالاِسْلاَم؟ ''اسلام کیا ہے۔''

نبی علیہ السلام نے پھر جواب دیا۔ وہ پھر کہنے لگا:

صَدَقْتَ ''آپ نے سچ فرمایا۔''

اس پر ہم اور زیادہ حیران ہوئے۔

پھر تیسرا سوال پوچھا:

مَاالاِحْسَان؟ ''احسان کیا ہے۔''

تو نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

اَنْ تَعْبُدُوْا اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ وَ اِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہُ یَرٰکَ

''کہ تو اللہ کی عبادت ایسے کر جیسے تو اللہ تعالیٰ کو دیکھتا ہے، اور اگر تجھے یہ کیفیت نصیب نہیں تو ایسے

عبادت کر کہ جیسے اللہ تجھے دیکھتا ہے۔''

یہ ہے احسان۔خود اللہ نے اس کا نام ''احسان'' پسند کیا۔

وہ آدمی یہ تین سوال پوچھ کر چلا گیا۔بعد میں نبی علیہ السلام نے فرمایا:

هٰذَا جِبْرَئِيْلُ اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ

''یہ جبرئیل تھے، یہ تمہیں تمہارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔''

اس لیے کہ بعض باتیں بندہ خود نہیں پوچھ سکتا۔اللہ نے سبب بنا دیا باتیں کھلنے کا۔

اب دیکھیے ! نبی علیہ السلام کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ تمہیں تمہارا دین سکھانے کے لیے۔کیوں جی ! پھر علم الاحسان، دین ہے یا نہیں؟ بالکل دین ہے۔اور جو بندہ یہ کہے کہ یہ بدعت ہے تو اسی سے پتہ چل گیا کہ ان کا مبلغ علم کتنا ہے۔پتہ چل گیا کہ ان بے چاروں کو قرآن اور حدیث کا کتنا علم ہے۔بہر حال اس حدیث سے یہی پتہ چلا کہ یہ باطن کی صفائی، تزکیہ اور علم الاحسان دین ہے۔یہ دین سے کوئی الگ چیز نہیں۔

حدیثِ جبرئیل کے جزیات پر ایک نظر:

اب اس حدیث پاک پر تھوڑا سا غور کریں کہ اس میں تین اہم اور بنیادی سوال پوچھے گئے۔ایک ایمان کے متعلق، دوسرا اسلام کے متعلق اور تیسرا احسان کے متعلق.....اب ذرا توجہ فرمائیں۔

☆ایمان کے متعلق جو باتیں ہوتی ہیں وہ ''ماننے کی باتیں'' ہوتی ہیں۔ایمان کہتے ہی ماننے کو ہیں۔

☆اسلام کے متعلق جو باتیں ہوتی ہیں وہ ''کرنے کی باتیں'' ہوتی ہیں۔

☆احسان کے متعلق جو باتیں ہوتی ہیں وہ ''سمجھنے کی باتیں'' ہوتی ہیں۔

اب اگر انسان کا ایمان بغیر سمجھ کے ہوتو وہ کمزور ہوتا ہے اور اگر سمجھ کے ساتھ ایمان ہوتو وہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔

ایک صاحب مناظرہ کرنے لگے۔ مناظرے کے دوران فریق مخالف نے کہا: میں تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہوں اور تم تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو کافر سمجھو۔ جواب میں وہ مناظر صاحب کہنے لگے: اچھا ایسے ہی سہی۔ فَقَد كَفَرَ ''وہ تو کافر ہوگیا''۔ اس کے پاس ایمان تھا مگر سمجھ نہیں تھی۔ اس بد بخت نے اس کو ایمان سے محروم کر دیا۔ ہم زندگی میں ایک لمحہ کے لیے بھی ایسا نہیں کہہ سکتے..... جیسے قمیص ہے، وہ ہر وقت جسم پر ہونا ضروری ہے۔ ورنہ ننگا شمار ہوگا۔ ایسے ہی دین ہے اور یہ ہر وقت ضروری ہے، ورنہ دین سے انسان خالی ہوگا۔ چونکہ اس بے چارے کو سمجھ نہیں تھی اس لیے اس نے کہہ دیا: اچھا! تھوڑی دیر کے لیے میں اپنے آپ کو کافر سمجھ لیتا ہوں۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

بس! یہ بات یاد رکھیں کہ جب سمجھ کر ایمان لایا جائے تو وہ مضبوط ہوتا ہے اور اگر بے سمجھے کی باتیں ہوں تو محروم ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ جس کو چیز کی قیمت کا پتہ ہی نہ ہو وہ اس کی حفاظت کیسے کرے گا؟

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں: جب میں بچہ تھا اس وقت والدہ نے سونے کی انگوٹھی بنوا کر میری انگلی میں پہنا دی۔ میں وہ پہن کر باہر نکلا تو ایک ٹھگ آ گیا۔ اس کے پاس گڑ تھا۔ اس نے مجھے گڑ کی ڈلی چکھائی۔ اس نے پوچھا: سناؤ! کیسی ہے؟ میں نے کہا: بڑی میٹھی ہے۔ پھر کہنے لگا: اب اپنی انگوٹھی کو چوسو۔ میں نے اسے چوسا تو اس میں کوئی لذت ہی نہیں تھی۔ اس کے بعد وہ کہنے لگا: یہ میٹھی چیز تم لے لو اور وہ پھیکی چیز مجھے دے دو۔ میں تیار ہوگیا۔ چنانچہ میں نے گڑ کی ڈلی لے لی اور سونے کی انگوٹھی دے دی۔

جو بے سمجھے ایمان لائے گا اس کا یہی حال ہوگا۔ وہ اس سے جلدی محروم ہو جائے گا۔ اس لیے

''احسان'' ایمان کی حفاظت کا سبب ہے۔جس کو احسان والی کیفیت حاصل ہوگی وہ کبھی ایمان سے محروم نہیں ہوگا۔

ملاجیونؒ فرماتے ہیں کے انسان کے ایمان کو سب سے زیادہ خطرہ موت کے وقت ہوتا ہے۔کتنے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے مرتے وقت شیطان ایسے حربے استعمال کرتا ہے کہ وہ ایمان سے محروم ہو جاتے ہیں۔تو موت کے وقت اس بندے کا ایمان سلامت رہے گا جس کے پاس ایمان کے ساتھ احسان بھی ہوگا۔اس وقت یہ ظاہری دلیلیں نہیں چلتیں۔

عالم نزع میں شیطان کا حملہ:

امام رازیؒ نے اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایک سو دلیلیں قائم کیں۔کہتے ہیں کہ جب ان کی موت کا وقت آیا تو شیطان بد بخت آ گیا۔وہ مردود کہنے لگا: رازی خدا تو موجود ہی نہیں ہے۔انہوں نے فرمایا: اس کے تو بے شمار دلائل ہیں۔چنانچہ پھر امام رازیؒ نے ایک دلیل دی۔مگر اس مردود نے دلیل کو توڑ دیا۔انہوں نے پھر دوسری دلیل دی۔اس نے پھر توڑ دی۔اس طرح امام رازیؒ نے سو دلیلیں دیں اور اس نے سو دلیلوں کو توڑ دیا۔اس سے امام رازیؒ گھبرا گئے۔مگر ان کا اللہ والوں سے تعلق تھا۔جب گھبرائے تو ان کو اپنے شیخ کا چہرہ نظر آیا۔شیخ اس وقت جلال میں تھے اور فرما رہے تھے: رازی! تو اس بد بخت کو یہ کیوں نہیں کہتا کہ میں اللہ کو بغیر دلیل کے مانتا ہوں۔

اللہ اکبر! ایمان محفوظ ہو گیا کیونکہ شیطان کے پاس اس بات کا توڑ نہیں تھا۔تو موت کے وقت شیطان کا حملہ سب سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔اس وقت جس کے پاس ایمان کے ساتھ احسان بھی ہوگا اس کا ایمان محفوظ رہے گا۔اس لیے ہمارے اکابر موت کے وقت ہنستے مسکراتے دنیا سے چلے جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ہی شیطان بد بخت کو اس سے دور رکھتے ہیں۔دنیا کا بھی یہی دستور ہے کہ اپنے پیاروں

کے قریب ڈاکوؤں اور چوروں کو کوئی نہیں آنے دیتا۔اللہ تعالیٰ بھی اپنے پیاروں کے قریب موت کے وقت اس شیطان بد بخت کو نہیں آنے دیتے۔تو ایمان ہمیشہ کے لیے۔ہم ایک سیکنڈ کے لیے بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم ایمان والے نہیں ہیں۔یاد رکھیں!بستہ بستن سے ہے۔یعنی بندھنے سے۔اور ایمان بندھنے کا دوسرا معنی ہے لہٰذا ہم ہر ہر لمحے کے لیے اللہ کی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔

اصل تو شریعت ہی ہے:

طریقت،حقیقت میں شریعت کی محافظہ اور شریعت کی خادمہ ہے۔یہ شریعت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔احسان ہوگا تو نماز محفوظ،احسان ہوگا تو گناہوں سے محفوظ،اصل تو شریعت ہی ہے۔

صحبتِ صلحاء، بے ریا عبادت سے افضل کیوں؟

ایک مرتبہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیعؒ نے حضرت تھانویؒ سے عرض کیا:حضرت!شاعر لوگ جب شعر کہتے ہیں تو کسی کو گھٹا دیتے ہیں اور کسی کو بڑھا دیتے ہیں.....یہ ایک انسانی فطرت ہے،گھٹا بڑھا دیتے ہیں،افراط وتفریط کے مرتکب ہوجاتے ہیں.....حضرت تھانویؒ نے پوچھا:کیسے؟انہوں نے کہا:حضرت!مولانا رومؒ نے جو یہ شعر کہا ہے

یک زمانہ صحبتے با اولیا بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

مجھے تو اس میں افراط وتفریط نظر آتی ہے کہ اللہ والوں کی ایک لمحہ کی صحبت سو سال کی بے ریا عبادت سے بہتر ہے۔اگر یہ کہہ دیتے کہ سو سال کی عبادت سے بہتر ہے تو کہا جاسکتا تھا کہ ہاں بھئی!ریا والی عبادت ہوگی جس سے واقعی بہتر ہے۔وہ کہتے ہیں:نہیں سو سال کی بے ریا عبادت سے بہتر ہے،اس لیے مجھے اس میں افراط وتفریط نظر آتی ہے۔

اس کے جواب میں حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:اچھا!میں اس شعر کو پڑھوں۔انہوں

نے کہا: جی حضرت! آپ پڑھیں۔ تو حضرت نے پڑھا:

یک زمانہ صحبتے با اولیا بہتر از ''لکھ'' سالہ طاعت بے ریا

یعنی اللہ والوں کی صحبت کا ایک لمحہ ایک لاکھ سال کی بے ریا عبادت سے بہتر ہے۔

اب وہ اور زیادہ حیران ہوئے کہ سو سال سمجھ میں نہیں آرہے تھے اور حضرت نے لاکھ سال کی بات کر دی۔ پھر حضرتؒ نے بات سمجھائی۔ حضرت نے فرمایا: دیکھو! اگر کوئی بندہ لاکھ سال تک عبادت کرے تو کیا اس کو اپنے ایمان کو محفوظ لے جانے کا یقین ہوتا ہے؟ عرض کیا: حضرت! یقین تو کسی کو نہیں ہوسکتا کہ پتہ نہیں موت کے وقت کیا ہوگا۔ حضرت نے فرمایا: دیکھیں! شیطان بد بخت نے کتنی عبادت کی تھی۔ ہزاروں سال۔ چپے چپے پہ سجدے کئے۔ بالآخر محروم ہوگیا۔ بلعم باعور نے تین سو سال عبادت کی اور اس کو دھتکار دیا گیا۔ اس لیے یہ یقین تو کسی کو بھی نہیں کہ موت کے وقت کیا ہوگا۔ اتنی عبادت کے باوجود بھی خطرہ ہے کہ پتہ نہیں موت کے وقت کیا ہوگا۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ لاکھ سال کے بعد بھی خطرہ ہے۔ کچھ نہیں کہہ سکتے اور اگر اللہ والوں کی تھوڑی دیر کی صحبت بھی انسان اختیار کرلے تو نبی علیہ السلام گواہی دے رہے ہیں:

هُمْ رِجَالٌ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ ''یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس بیٹھنے والا بد بخت نہیں ہوتا''

اور بد بخت وہ ہوتا ہے جو موت کے وقت ایمان سے محروم ہوجائے

جب اللہ کے محبوب ﷺ نے فرمادیا کہ وہ بد بخت نہیں ہوسکتا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی صحبت میں بیٹھنے والے کو اللہ تعالیٰ موت کے وقت ایمان کے ساتھ دنیا سے جانے کی توفیق دے دیتے ہیں۔ چنانچہ لاکھ سال کی عبادت سے بھی وہ نتیجہ نہ ملا جو ان کی ایک لمحہ کی صحبت سے مل گیا، اس لیے یہ

صحبت زیادہ اعلیٰ ہوتی ہے۔

اخلاصِ نیت کا نام تصوف ہے:

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تصوف بدعت ہے، ان سے اتنی سی بات پوچھنے کی ضرورت ہے کہ اعمال کا دارومدار کس پر ہے؟ حالانکہ بخاری شریف کی پہلی حدیث ہی اس کے بارے میں ہے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات تو پھر نیت کو صحیح کرنا ضروری ہوا کہ نہ ہوا؟ وہ بے چارے بخاری شریف کا نام تو لیتے ہیں، کیا ہی بہتر ہوتا اگر وہ پہلی حدیث ہی غور سے پڑھ لیتے۔ پہلی حدیث ہی یہ بتا رہی ہے کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور نیت کو خالص کرنے کا نام ہی تو تصوف ہے۔ ہمارے مشائخ آٹھ آٹھ سال اپنے مشائخ کی خدمت کرتے تھے اور اتنے طویل عرصے کے بعد فرماتے تھے کہ ہم نے ابھی تک فقط نیت کرنا سیکھی ہے۔ یہ نیت ایسے ہی تھوڑا سیکھی جاتی ہے۔ یہ نیت مشائخ کی جوتیاں سیدھی کرنے سے آتی ہے۔

یاد رکھیں! ہندوستان میں تو اسلام آیا ہی مشائخ کے ذریعے سے اور پھر اللہ نے اسلام کو چمکایا علما کے ذریعے سے۔ اس لیے ہم علما کے بھی قدردان ہیں اور مشائخ کے بھی۔

سلاسل تصوف کی منزل:

تصوف کے تمام سلاسل کی منزل ایک ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ جی! وہ کیسے؟ اس کو ایک مثال سے سمجھیں۔ دیکھو! پہاڑ کی چوٹی پر ایک محل بنا ہوا ہے۔ ایک راستہ اِدھر سے جاتا ہے، دوسرا راستہ اُدھر سے، تیسرا اِدھر سے اور چوتھا اُدھر سے۔ تو راستے مختلف ہیں مگر منزل ایک ہی ہے۔ اسی طرح یہ چار راستے محسوس ہوتے ہیں مگر ان سب کی منزل ایک ہی ہے۔ شیخ الاسلامؒ فرماتے تھے:

''کوئی نقشبندی ہے، کوئی چشتی ہے، کوئی قادری ہے، کوئی سہروردی ہے، اگر دل میں ایک خدا کی یاد ہے تو

تم سب کچھ ہو ورنہ تم کچھ بھی نہیں ہو۔‘‘

تو تمام سلاسل کا مقصود اللہ رب العزت کی یاد ہے اور سلسلہ کے اسباق سے انسان کو یہ کیفیت نصیب ہو جاتی ہے۔ یہ نیت انسان مشائخ کے پاس آ کر سیکھتا ہے۔ نیت سے ہی تو عمل بدل جاتا ہے۔

غسل کرنے میں نیت کا دخل:

مولانا یحییٰؒ جو حضرت شیخ الحدیثؒ کے والد تھے، ان کا ایک عجیب واقعہ ہے۔ جب گرمیوں کے موسم میں عصر کے وقت مدرسے سے چھٹی ہوتی تھی تو وہ ایک کنویں پر چلے جاتے تھے۔ وہاں جا کر بیٹھ جاتے اور طالب علموں کو کہتے کہ میرے اوپر ڈول بھر بھر کے ڈالتے جاؤ۔ یوں سینکڑوں ڈول پانی کے ڈلواتے۔

حضرتؒ کا ایک ہمسایہ تھا۔ وہ ایک دن کہنے لگا: ’’مولانا! ہمیں تو کہو اسراف ہووے، خود کرتے جاؤ۔‘‘ یعنی مولانا! ہمیں تو آپ کہتے ہیں کہ یہ اسراف اور فضول خرچی ہے اور خود سینکڑوں ڈول ڈلواتے رہتے ہیں، یہ بھی تو اسراف ہے۔ تو وہ چونکہ قریبی بھی تھا اور بے تکلفی بھی تھی، اس لیے حضرت جواب دیتے تھے: یہ میرے لیے جائز اور تیرے لیے حرام۔ چنانچہ ایک دن وہ کہنے لگا: مولانا! مجھے یہ بات آپ سمجھا دیں کہ آپ کے لیے کیسے جائز ہے اور میرے لیے کیسے حرام ہے؟

ایک دن منت کرنے لگا: مولانا! آج تو آپ یہ مسئلہ سمجھا ہی دیں۔ تو پھر مولانا نے ان کو بات سمجھائی اور پوچھا: اچھا! جب تم کنویں پر آتے ہو تو کس نیت سے آتے ہو؟ اس نے کہا: جی! نہانے کی نیت سے آتا ہوں۔ فرمایا: پھر تیرے لیے یہی حکم ہے کہ پانچ ڈول سے نہاؤ اور پھر چلے جاؤ، اس سے زیادہ کرو گے تو اسراف ہوگا۔ اس نے پوچھا: آپ کیا کرتے ہیں؟ فرمانے لگے: میں تو بیمار آدمی ہوں، اس لیے گرمی کے موسم میں ٹھنڈک حاصل کرنے کی نیت سے آتا ہوں۔ چنانچہ اس طرح ایک ہزار ڈول بھی ڈال لوں تو میرے لیے جائز ہوگا۔

اب دیکھیں کہ یہ ایک چھوٹا سا عمل ہے، اگر اس کو ایک عام آدمی کرتا تو شریعت اسراف کا حکم لگا کر حرام کہتی ہے اور اگر اسی عمل کو ایک عالم کرتا ہے لیکن بیماری دور کرنے کا سبب سمجھ کر استعمال کرتا ہے تو شریعت اس کی اجازت دیتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ نیت کا سیکھنا بھی ضروی ہے۔

وقوفِ قلبی میں مدد کیسے:

اچھا! یہ بتائیں کہ ہوائی جہاز پر سوار ہوتے وقت کون سواری کی دعا پڑھتا ہے۔ اس طرف دھیان ہی نہیں جاتا کہ یہ بھی کوئی سواری ہے۔ بھئی! سواری پانی میں چل رہی ہو یا ہوا میں جا رہی ہو، ہے تو سواری۔ اس لیے دعا تو پڑھنی چاہیے۔

بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَ مُرْسٰهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (ھود:41)

لیکن لفٹ کا بٹن دباتے ہوئے نہیں یاد آئے گا، جب تک شیخ نہیں بتائے گا کہ یہاں بھی کوئی دعا پڑھنی ہے۔ بہت سے لوگ حج عمرے پر جاتے ہیں اور حرم شریف میں نمازوں کے بعد اعلان ہوتا ہے: الصلوۃ علی الاموات۔ ''نماز جنازہ ہوگی۔'' یہ اعلان سن کر کتنے لوگ ہیں جو اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (البقرہ:156) پڑھتے ہیں۔ علما بھی جاتے ہیں اور سنتے بھی ہیں، ذرا دل سے پوچھیں کہ کبھی اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (البقرہ:156) پڑھی ہے۔ حالانکہ الصلوٰۃ علی الاموات کے الفاظ سے ایک میت کی خبر مل رہی ہے۔ تو میت کی خبر ملنے پر سنت کیا ہے؟ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (البقرہ:156) پڑھنی چاہیے، تو پھر کیا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (البقرہ:156) پڑھنی یاد آتی ہے؟ بھئی! یاد تو تب آئے گی نا، جب شیخ یاد کرائے گا۔ یہ شیخ ہی بتاتا ہے کہ مسنون دعائیں پڑھنے سے وقوف قلبی میں مدد اور تقویت ملتی ہے۔

مشائخ کے ہاں علم کی قدر ومنزلت:

مشائخ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ علم کے مخالف ہوتے ہیں۔بھئی! مشائخ صوفیا علم کے مخالف نہیں ہوتے۔ہاں! اگر کسی بندے نے کسی خاص جذبے میں اور کسی خاص کیفیت میں ایسی بات کر دی تو وہ انفرادی بات کہی جائے گی۔اور جو لوگ کہیں ''علموں بس کریں او یار'' ہم ان کے پیچھے چلنے والے نہیں۔ہمارے جتنے بھی مشائخ تھے وہ سب کے سب علم کے زیور سے آراستہ تھے۔چنانچہ طبقہ اول کے تمام مشائخ اپنے مریدین کو علم حاصل کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔مثال کے طور پر:

☆ سید الطائفہ جنید بغدادیؒ نے فرمایا:

مَنْ لَمْ يَقْرَءِ الْقُرْآنَ وَلَمْ يَكْتُبِ الْحَدِيْثَ لَايُقْتَدٰى بِهٖ فِيْ هٰذَا الْاَمْرِ

''جو قرآن اور حدیث نہیں پڑھا وہ ہمارے اس کام کے اندر مقتدا ہی نہیں۔''

ہمارے مشائخ تو حکم فرماتے تھے۔

☆ مکتوبات صدی میں بھی لکھا ہے کہ سالک کو علم حاصل کیے بغیر اس راستے پر قدم نہیں رکھنا چاہیے۔

☆ ابن جوزیؒ جیسی ناقد اور محتاط شخصیت بھی فرماتے ہیں:

وَ مَا كَانَ الْمُتَقَدِّمُوْنَ فِي التَّصَوُّفِ اِلَّا رُؤُوْسًا فِي الْقُرْآنِ وَالْفِقْهِ وَالْحَدِيْثِ

''تصوف کے متقدمین قرآن، فقہ، اور حدیث میں سردار تھے''

انہوں نے یہ عبارت تلبیس ابلیس کے اندر لکھی ہے۔

معلوم ہوا کہ ایسے حضرات بھی مشائخ اور صوفیا کو ماننے والے تھے۔

مشائخ پر اعتراضات کیوں ہوئے؟

یہاں سوال ذہن میں آتا ہے کہ پھر مشائخ پر اعتراضات کیوں ہوئے؟

بھئی! بسا اوقات انسان کے اندر کسی کا کلام سمجھنے کی استطاعت نہیں ہوتی۔ اور جب سمجھ نہیں پاتا تو انسان کی فطرت ہے کہ

"اَلنَّاسُ اَعْدَاءٌ لِمَا جَهِلُوْا" جب بات سمجھ میں نہیں آتی تو مخالفت کرتے ہیں۔ چنانچہ بڑے بڑے مشائخ کی مخالفت ہوئی۔ مثلاً

☆ ایک ایسا وقت آیا کہ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کی کتابوں کو جلا دیا گیا۔ اور بعد میں جب دوسرے علما نے ان کی باتوں کو کھولا تو غلط فہمی دور ہونے پر آب زر سے لکھوایا گیا۔ لہٰذا پتہ چلا کہ جہاں کہیں ایسا ہوا تو وہ بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوا۔

☆ کتاب الشفا کے مصنف قاضی عیاضؒ پر بعض لوگوں نے یہودیت کی تہمت لگا دی۔ اور بعد میں حقیقت کھلی تو پھر اس کتاب کو شفائے شریعت کہنے لگے کیونکہ نبی علیہ السلام کے بارے میں واقعی کوئی ایسی کتاب نہیں ملتی۔

☆ شیخ احمد کبیر رفاعیؒ کو ایک مرتبہ ملحد اور کافر کہہ کر سرعام رسوا کیا گیا اور پھر ایک وہ وقت آیا کہ جب ان کو بہت بڑا شیخ مانا گیا۔ وجہ یہی بنی کہ لوگوں نے ان کی باتوں کے اپنے مطلب نکال لیے تھے۔ بھئی! جو صاحب کلام ہوتا ہے، حق اسی کا ہوتا ہے کہ وہ بتائے کہ میرے کلام کی منشا کیا ہے۔ اب یہ تو مناسب نہیں کہ کہنے والا کسی اور مقصد کے لیے بات کہے اور سننے والے نے اپنا مطلب نکال لیا۔ وہ تو پتہ نہیں کیا سے کیا مطلب نکال لیں گے۔ اسی کو تو کہتے ہیں:

تَوْجِيْهُ الْقَوْلِ لِمَا لَا يَرْضٰى بِهِ الْقَائِل

''قول کا ایسا معنیٰ کرنا جس پر قائل راضی نہ ہو''

کہنے والے نے کہا: روکو! مت جانے دو۔ اور مطلب نکالنے والے نے کہا: روکو مت! جانے دو۔ یعنی بات کچھ تھی اور نتیجہ کچھ نکال لیا۔ ان مشائخ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

پاکباز مشائخ کا دفاع:

چنانچہ اللہ رب العزت نے مختلف ادوار میں ایسی عبقری شخصیات کو پیدا کیا جنہوں نے ان پاکباز مشائخ کا دفاع کیا۔ مثال کے طور پر:

☆ ابن جوزیؒ نے ''صفوۃ الصفوۃ'' کتاب لکھی۔

☆ علامہ شمس الدین ذہبیؒ نے ''سِیَرُ اَعلَامِ النُّبَلا'' کتاب لکھی۔

☆ عبدالرحمٰن جامیؒ نے ''نفحات الانس'' کتاب لکھی۔

☆ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے ''اخبار الاخیار'' کتاب لکھی۔

☆ علامہ عبدالوہاب شعرانیؒ نے ''الطبقات الکبریٰ'' کتاب لکھی۔

ان کتابوں میں ان علما نے مشائخ صوفیا کی زندگیوں کو کھولا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کے ذہنوں میں ان مشائخ کے بارے میں جو شکوک وشبہات تھے وہ سب ختم ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اس پاک باز جماعت کے دفاع کا خود انتظام فرما دیا۔

اس کے علاوہ تصوف پر جو اور اعتراضات تھے، امام ربانی مجدد الف ثانیؒ نے آ کر ان تمام اعتراضات کی مٹی کو صاف کر دیا۔ چنانچہ ان کے مکاتیب کو پڑھ کر دیکھیے، واقعی انہوں نے شریعت وطریقت کے

تلازم کو سامنے رکھا۔

قریب کے زمانے میں حضرت اقدس تھانویؒ کو اللہ تعالیٰ نے اتنا علم ظاہری بھی عطا کیا کہ حضرت نے دو ہزار سے زیادہ کتابیں لکھیں اور علم باطن سے بھی اللہ نے نوازا۔ اگر آپ ان کی تفسیر ''بیان القرآن'' کا حاشیہ پڑھیں تو اس میں ''مسائل سلوک'' کے نام سے قرآن کی آیات سے اخذ ہونے والے سلوک کے مسائل کو کھولا گیا ہے۔ بندہ پڑھ کر حیران ہوتا ہے کہ اللہ والوں کو قرآن پڑھ کر واقعی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

اعتدال کا راستہ:

ہمارا راستہ اعتدال کا راستہ ہے۔ ہم علم کے پیچھے اتنا بھی نہیں پڑتے کہ مشائخ کو برا سمجھیں اور مشائخ کے بھی اتنا پیچھے نہیں لگتے کہ علم کو برا سمجھیں ؎

درکفِ جام شریعت درکفِ سندانِ عشق ہر ہوسناکے نہ داند جام وسندان باختن

ہر بندہ یہ کام نہیں کرسکتا۔ ہمارے اکابر علما دیوبند کو اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطا فرمائی تھی۔ چنانچہ ہم ان لوگوں میں سے بھی نہیں جو اَلعِلمُ حِجَابُ الاَکبَر کا نعرہ لگا کر علمائے کاملین کو گمراہ کہیں۔ اور نہ ہی ان لوگوں میں سے ہیں جو تصوف کو عجمی چیز کہیں اور نماز کی حضوری سے محروم رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مشائخ جب مسندِ حدیث پر بیٹھتے تھے تو عسقلانیؒ اور قسطلانیؒ کی یادیں تازہ کردیتے تھے اور جب مسند ارشاد پر بیٹھتے تھے تو جنید اور بایزیدؒ نظر آیا کرتے تھے۔

مقصودِ تصوف:

تصوف کا مقصد تین باتیں ہیں۔

(۱) خوفِ خدا (۲) اتباعِ مصطفیٰ (۳) مخالفِ نفس وھوٰی

جس کو یہ تین چیزیں حاصل ہیں اس کو تصوف کا مقصود حاصل ہوگیا۔ اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھ کر یہ چیزیں انسان کو نصیب ہوتی ہیں۔ بتائیں! کیا یہ تین چیزیں شریعت سے ہٹ کر ہیں۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ پھر کیوں تصوف کی مخالفت کرتے ہیں۔

کسی نے حضرت اقدس تھانویؒ سے پوچھا: حضرت! تصوف کا مقصود کیا ہے؟ تو حضرت نے عجیب جواب دیا۔ فرمایا: تصوف کا مقصود یہ ہے کہ انسان کی رگ رگ اور ریشے ریشے سے گناہوں کا کھوٹ نکل جائے۔

علماء مشائخ کی دہلیز پر:

وقت کے بڑے بڑے علما نے آکر مشائخ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مثال کے طور پر:

علامہ شامیؒ نے مولانا خالد رومیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے مرزا جان جاناںؒ سے بیعت کی۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت کی۔

جامعہ اشرفیہ لاہور کے بانی حضرت مفتی محمد حسنؒ نے حضرت اقدس تھانویؒ سے بیعت کی۔

علاوہ ازیں حضرت قاری محمد طیبؒ، حضرت مفتی محمد شفیعؒ، حضرت بنوریؒ اور حضرت جالندھریؒ نے بھی اپنے مشائخ سے علم ظاہر بھی حاصل کیا اور علم باطن سے بھی مزین ہوئے۔

یہ ہمارا راستہ ہے جسے ہم اعتدال کا راستہ کہتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہمیں اعمال بھی نصیب ہوں اور اعمال کی کیفیات بھی نصیب ہوں۔

سیرت پر زیادہ محنت کریں:

دیکھیں! ایک ہوتا ہے، بانس۔ وہ خشک ہوتا ہے اور اس کی ایک خاص شکل ہوتی ہے۔ اور ایک ہوتا ہے ، گنا۔ اگر آپ اگنے والے پتلے بانس کو کاٹیں اور ادھر سے گنے کو کاٹیں تو قریب رکھنے سے دونوں بالکل ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ مگر ایک رس سے خالی ہوتا ہے اور دوسرا رس بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح جو بندے تصوف کو سیکھے بغیر اعمال کرتے ہیں، وہ بانس کی طرح ہیں اور جو سیکھ کر اعمال کرتے ہیں وہ گنے کی طرح ہوتے ہیں۔ یعنی ایمان کی حلاوت سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

اگر ایک عام مزدور کو آپ گھر لائیں اور کہیں جی! فرش توڑنا ہے تو وہ آئے گا، ہتھوڑا چلائے گا اور شام کو اپنی مزدوری لے کر چلا جائے گا۔ البتہ وہ ہتھوڑا چلاتے ہوئے بے دلی سے چلائے گا۔ اور ایک تھا، فرہاد۔ اس کو لوگوں نے کہا تھا کہ اگر تم پہاڑ کھود کر دودھ کی نہر نکالو تو تمہارے محبوب سے تمہارا وصل ہو جائے گا۔ وہ بھی پہاڑ توڑتا تھا۔ لیکن جو ضرب مزدور لگاتا ہے وہ بے دلی سے لگاتا ہے اور جو فرہاد ضرب لگاتا تھا وہ دل کی محبت سے لگاتا تھا۔ کہنے والے نے کہا:

ہر ضرب تیشہ ساغرِ کیفِ وصال دوست فرہاد میں جو بات ہے مزدور میں نہیں

''جب فرہاد ضرب لگاتا تھا تو ہر تیشے کی ضرب پر اس کو لگتا تھا کہ میں اپنے محبوب کے وصل کا جام پی رہا ہوں۔ اس لیے کہ مزدور میں عشق کی وہ بات ہی نہیں تھی جو فرہاد میں تھی۔''

آج ہم مزدور والی نمازیں پڑھ رہے ہوتے ہیں، جبکہ اللہ والے فرماتے ہیں: آؤ! فرہاد والی نمازیں پڑھو۔ ہم بے ذوق سجدے اور بے سرور نمازیں کب تک پڑھتے رہیں گے۔ اپنے من کو صاف کرلیں تاکہ پھر ایسی نماز نصیب ہو کہ

اَنۡ تَعۡبُدُوۡا اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ وَ اِنۡ لَّمۡ تَكُنۡ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرٰكَ

کا مصداق بن جائیں اور صورت کی بجائے سیرت پر زیادہ محنت کریں۔

دلِ مردہ، دل نہیں ہے

اللہ تعالیٰ ہمیں دلوں کو جگانے کی توفیق عطا فرمائے

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

جب دل زندہ ہو جاتا ہے تو پھر انسان اللہ رب العزت کی رضا کے لیے اعمال کرتا ہے۔ چنانچہ ہمارے مشائخ نے فرمایا: نہ ہم نے رونا ہے نہ رلانا ہے، نہ اڑنا ہے نہ اڑانا ہے، ہم نے تو بس روٹھے یار کو منانا ہے۔ تصوف کا مقصود بھی یہی ہے کہ اللہ راضی ہو جائے۔ اور اللہ تعالیٰ اس وقت راضی ہوتے ہیں جب انسان کے دل میں خوفِ خدا ہو، اس کے اعمال میں اتباعِ مصطفیٰ ہو اور مخالفتِ نفس وھویٰ ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنی اصلاح کی تڑپ عطا فرما دے۔ جب دل میں آگ لگ جاتی ہے تو پھر بندے کو اپنی اصلاح کے لیے وقت گزارنا آسان ہو جاتا ہے۔

اللہ رب العزت ہمارے من کی بیماریوں کو ختم فرما دے اور ہمیں اپنی سچی محبت عطا فرما دے۔ (آمین ثم آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ